پروفیسر محمد فیروز فاروقی

اقبالؒ کا تصوّرِ توحید

فلسفۂ اقبال کا مرکز و محور خودی کا تصوّر ہے اور اقبال کے تمام تر تصورات اور نظریات اسی تصوّر سے ماخوذ ہیں۔ خودی کے تصور کی تبلیغ اور تشہیر ہی وہ مقصدِ خاص ہے جسے حاصل کرنے کے لیے اقبال نے مقامی حالات اور روایات کو ملحوظ رکھ کر نظم کا وسیلہ اختیار کیا تھا۔[1]

اقبال کے تصوّرِ خودی کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس انقلابی تصوّر کا لازمی نتیجہ بے پناہ فکری و عملی قوت کا ظہور ہے۔ یہ انقلاب، اس فکری اور عملی قوت کے اظہار کے لیے جس میدانِ کار کی تلاش کرتا ہے اس کا عنوان ہے باطل کا مکمل استیصال اور قوتِ توحید کا معاشرے میں عملی نفاذ۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے فلسفہ میں خودی کے جس انقلاب کی دعوت پائی جاتی ہے اس کا سب سے بڑا اور اہم مقصد "عقیدۂ توحید" کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تمدنی قوت کا اظہار ہے۔

اقبال کے تصوّرِ خودی اور تصوّرِ توحید کی تفہیم ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہے مسلمانوں کے علمی، فکری اور تہذیبی زوال کے ساتھ توحید کے جس گمراہ کن، ڈھیلے ڈھالے اور غیر واضح تصور نے جنم لیا، وہی حقیقی تصور کی حیثیت سے اپنا لیا گیا۔ چنانچہ تصوف، باطنیت اور مافوق الفطرت پرستی کے رجحان نے قرآن کریم کے پیش کردہ تصورِ توحید میں جن عناصر کی آمیزش کی تھی، انھیں ابدی حقیقتیں سمجھ کر اپنا لیا گیا اور ان عناصر کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن ہی کی آیات سے استدلال کیا جانے لگا، جس کے نزول کا واحد مقصد عقیدۂ توحید کی

---

[1] علامہ اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط (مورخہ ۴ اگست ۱۹۱۳ء) میں نظم کے وسیلے کو اختیار کرنے کی وضاحت انھی الفاظ میں کی تھی۔

نشر و اشاعت اور اس کی ہمہ گیر قوت کا نفاذ تھا۔

زوال پذیر مسلمان معاشروں کے مذہبی راہنماؤں نے مسلمانوں کے سامنے عقیدۂ توحید کی جو تشریح کی ہے، اس کی رُو سے اسے زیادہ سے زیادہ ایک شعوری اور ذہنی قسم کا احساس قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی رو سے عقیدۂ توحید، دوسرے ذاتی عقائد کی طرز پر ایک جامد اور محدود نوعیت کا عقیدہ ہے اور اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ رہا عقیدۂ توحید کا تفاعلی کردار، تو وہ قرآن کے سیپاروں میں محفوظ ہے جسے سمجھنے کے لیے ژرف نگاہی درکار ہے۔

اقبال کے ہاں عقیدۂ توحید محض ایک عقیدہ نہیں اور یہ محض ایک اقرار کا نام نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کریم کی تعلیمات کے عین مطابق اقبال کا تصورِ توحید ایک ایسا شعوری اور عقلی احساس ہے جس میں جذبات، روحانیت، وجدان اور احساسات شریک ہیں۔ عقیدۂ توحید کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ ہم ایک خدا کا اقرار کر لیں۔ بلکہ اس کا تقاضا ایک ایسے احساس کو پیدا کرنا ہے جو دل و جان پر حاوی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اقرارِ توحید کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عقیدۂ توحید کے تفاعلی کردار کی وضاحت کے لیے یہی مثال پیش کرنا کافی ہوگا کہ پیغمبر اسلامؐ اور ان کے جاں نثار ساتھیوں نے عقیدۂ توحید اور اس کے تفاعلی کردار کی قوت ہی کی بدولت ایک عظیم سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی انقلاب برپا کیا تھا۔ اقبال عقیدۂ توحید کے تفاعلی کردار کی اسی قوت کو ملّتِ اسلامیہ کے احیا کا منبع یقین کرتے ہیں۔

اقبال کے کلام میں عقیدۂ توحید کی توضیح و تشریح کو مرکزی حیثیت کیوں حاصل ہے؟ اس کا جواب ہمیں مسلمانوں کے حالات میں تلاش کرنا چاہیے۔ اقبال اسلامی تاریخ کے ایک ایک ورق پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ملّتِ اسلامیہ کے عروج و زوال کی مکمل داستان ان کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ علاوہ ازیں اقبال نے دیگر اقوامِ عالم کی تاریخ کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ قرآن نے اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے جو ابدی اصول بیان کیے ہیں ان کی رُو سے مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں ان کی خود شناسی سرفہرست ہے۔ اقبال نے انہی خطوط پر اس مسئلہ کا

مطالعہ کیا تھا۔ اقبال نے علیٰ وجہ البصیرت محسوس کیا کہ مسلمانوں میں عقیدۂ توحید کی حیثیت علم کلام کے ایک موضوع سے زیادہ نہیں رہی۔ مسلمان صوفیا اور متکلمین نے عقیدۂ توحید پر اس انداز میں بحثیں چھیڑی ہیں کہ اس کی اصلیت اور روح اور حقیقت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ صوفیا اور باطنی بزرگوں نے توحید کی قسمیں بیان کرنے پر مستقل تالیفات تیار کر دیں۔ مثلاً توحید شہودی، توحید وجودی، توحید عینی، توحید ظنی، توحید افعالی، توحید ذاتی، توحید صفاتی، توحید حقیقی، توحید باطنی اور توحید کائناتی وغیرہ وغیرہ۔ وجودیت اور شہودیت پر بحث چھیڑ کر مسئلہ کی اصلیت کو ان ذہنی کاوشوں کے دبیز پردوں میں چھپا ڈالا۔ شریعت اور طریقت، ظاہریت اور باطنیت کی تفریق سے ایسے دلائل تلاش کیے کہ انسان موحد بھی ہو اور مشرک بھی۔ بعض صوفیا اور باطنی بزرگوں اور سطحی مذہبیت کے داعیوں کی انھی کوششوں نے عقیدۂ توحید کے تفاعلی کردار کو نسیاً منسیا کر دیا تھا۔ اقبال ان حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام

زوال پذیر مسلمان معاشروں میں جو نظام تعلیم رائج رہا ہے اس نے شرک کی تبلیغ میں اعانت کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ اس میں قرآن کریم کی مرکزی انحصاریت کو ختم کر کے یہی حیثیت روایات، مکاشفات، قصوں، کہانیوں اور کرامات کو دے دی گئی۔ اس بنیادی اور اساسی تبدیلی نے ملت اسلامیہ کے جسد کو موت کے کنارے لا کھڑا کیا۔ اقبال اسی پر نالہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں کہتے ہیں:

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ اُو زنّار دار است حرم چوں دیر بود او برہمن بود

"اساطیرِ کہن" اور "حدیثِ تخمین و ظن" کو رواج دینے کی ذمہ داری تصوف کے اس تصور پر عائد ہوتی ہے۔ جس نے قرونِ وسطیٰ کے ایرانی نظریات کی کوکھ سے جنم لیا اور

جیسے مسلمانوں کے سیاسی زوال کے زمانے میں نشوونما ملی۔ اقبال تصوف کے اسی منفی اور مضرت رساں کردار پر بحث کرتے ہوئے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں لکھتے ہیں:

"اب اسلام قرونِ وسطیٰ کے اس تصوف کی تجدید کو روا نہ رکھے گا، جس نے اسلام کے پیروؤں کے صحیح رجحانات کو کچل کر ایک مبہم تفکر کی طرف اس کا رخ پھیر دیا تھا۔ اس تصوف نے گزشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے سلطنت کو معمولی آدمیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا تھا۔ اب اسلام اس تجربہ کو دہرا نہیں سکتا۔ اسلام جدید تفکر اور تجربہ کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور اب کوئی ولی یا بزرگ بھی اس کو قرونِ وسطیٰ کے تصوف کی تاریکیوں کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا۔"

تاریخ شاہد ہے کہ تصوف کے تصورات نے مسلمانوں کو اُمتِ مسلمہ اور امتِ وسط کے کردار سے محروم کرنے میں بہت زیادہ حصہ لیا ہے۔ عقیدۂ توحید کی زندہ قوت کو تصوف اور باطنیت کے فلسفہ نے ہی زائل کیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مسلمان پیچھے اسی لیے رہ گئے ہیں کہ ان کے ہاں دین اسلام کی قرآنی تعلیمات کے خالص اور سادہ تصورات کو مسخ کر دیا گیا[۲]۔ مسلمانوں نے توحید کے خالص تصور کو ترک کر کے ایک مبہم اور غلط تصور کو اپنا لیا جس میں غیر اللہ کو کارساز، مشکل کشا، غیب دان اور مالک و مختار یقین کرنے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ قبروں کو عرسوں، میلوں اور اجتماعات کا مرکز قرار دیا گیا اور محدود مذہبیت کا ایک ایسا سلسلہ جاری کیا گیا جسے علامہ اقبال "قبروں کی تجارت" سے تعبیر کرتے ہیں:

ہو نیکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے — کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟
بُت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں — تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

علامہ اقبالؒ نے جس معاشرے کے حالات کا جائزہ لیا تھا اس میں انھیں مسلمان کا جہانِ توحید،

---

[۲] قرونِ وسطیٰ کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک تصوف اور باطنیت کے گمراہ کن فلسفہ نے مسلمان معاشرہ میں غلبہ حاصل کر کے مسلمانوں کے اجتہاد کے وصف کو مجروح نہیں کیا تھا اس وقت تک مسلمانوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی تھیں۔

ایک صنم کدہ کی صورت میں نظر آیا۔ فرماتے ہیں:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

یعنی مسلمانوں کا جہانِ توحید، صنم کدہ میں تبدیل ہو چکا ہے جس میں پتھر کی مورتیوں اور بتوں کی جگہ قبروں نے لے لی ہے اور جس میں رند و فقیہ و میر و پیر، ہر وقت گھات میں رہتے ہیں کہ کن طریقوں سے مسلمانوں کے مال کو اپنے قبضہ میں کریں اور ان مقاصد کے لیے انھوں نے نذر و نیاز، صدقات و خیرات اور ایسے ہی کئی طریقے ایجاد کیے ہیں:

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

احبار و رہبان نے عقیدۂ توحید اور اس کی تفصیلات کو اس قدر اوجھل کر دیا ہے کہ مسلمان کا قرآن پاک سے براہِ راست تعلق باقی نہیں رہا۔ اب دین نام ہے اسرارِ توحید کی ایسی تاویلات کا جو مافوق الفطرت پرستی کے جذبوں کی تسکین کا سامان فراہم کر سکیں۔ انہی حالات نے مذہبی اجارہ داروں اور واعظوں اور قصہ گو علما کو یہ جرأت دلائی ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے غلط معانی و مفہوم کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے میں دن رات مصروف ہیں:

چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدۂ پارس چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا کر چاہے تو خود ایک تازہ شریعت کرے ایجاد

اہلِ تصوّف کا خیال ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے تمام مسائل کا آسان ترین حل یہ ہے کہ تصوّف اور سلوک کی راہیں طے کی جائیں۔ دنیا و ما فیہا کو حقیر سمجھا جائے۔ آج مسلمان جن حالات میں گرفتار ہیں انھیں نوشتۂ تقدیر یقین کر لیا جائے۔ غیر مسلم اقوام کی طرف سے دینِ اسلام کو جو خطرناک علمی و فکری چیلنج درپیش ہے اس سے پہلوتہی کی جائے۔ اور مسلمانوں کی بدحالی کو فقر اور توکل کا لازمی نتیجہ قرار دیا جائے۔ لیکن اقبال ان تمام چیزوں کو عقیدۂ توحید اور اس کے تقاضوں کے لیے سمِ قاتل گردانتے ہیں:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے
ہے وہی شعر و تصوّف اس کے حق میں خوب تر جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اقبال فلسفہ و تصوّف اور باطنیت کے طریق کو طریقِ خانقاہی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ معاملے ہیں نازک، جو تری رضا ہو تو کر — کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

طریقِ خانقاہی پہ عمل کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ مسلمان موحد کہلانے کے باوجود مشرک ہونے میں کسی سے کم نہیں۔ توحید کا زبانی اقرار تو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عیسائیوں کے ہاں بھی توحید کا ایک مبہم اور غیر واضح تصور موجود ہے اور یہودیوں کے ہاں اسی قسم کا اقرار پایا جاتا ہے۔ عیسائی تثلیث کے عقیدہ کے باوجود اس بات کے دعوے دار ہیں کہ ان کے تین خدا دراصل ایک خدا کے عکس یا پرتو ہی ہیں۔ بدھ مت میں بھی توحید کا تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور اسی طرح کے زبانی اقرار کا تصور دیگر مذاہب میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی تعلیمات کا تقاضا اس قسم کا تصورِ توحید نہیں ہے جو موحد اور مشرک کے درمیان واضح خطِ امتیاز نہ کھینچ سکے، جو ایک انسان کو تمام طاغوتی رشتوں سے بے تعلق نہ کر دے، جو غیر اللہ کے ہزار سجدوں کی بجائے انسان میں ایک چوکھٹ پر جبینِ نیاز کو جھکانے کا سچا ایمان اور جذبہ نہ تخلیق کرے۔ یہی وہ پیغام ہے جو اقبال ہمیں دیتا ہے:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی — آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام

روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو — خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے — قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ — وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

اقبال کے نزدیک توحید کا خالص قرآنی تصور ایک تیغِ بے زنہار ہے۔ کلمۂ توحید کو ہم ایک عربی عبارت سمجھ کر ثواب حاصل کرنے کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ ۹۰ فیصد سے زیادہ مسلمانوں کو اس کلمہ کے معانی و مفہوم سے واقفیت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ہاں کلمۂ طیبہ کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اسے پڑھ کر ایک انسان اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ لا اور الا کے الفاظ میں مفہوم اور معانی کی جو دنیا آباد ہے اس سے عام مسلمان تو کجا، اکثر اہلِ علم بھی ناواقف ہیں۔ ان دو الفاظ کی ترتیب بھی اپنے اندر گہرے اسرار و رموز لیے ہوتے ہے۔ غور کیجیے کلمۂ طیبہ کا آغاز لفظِ "لا" سے ہوتا ہے۔ یعنی دینِ

اسلام کے تقاضوں کے مطابق ہمارے عقیدۂ توحید کی بنیاد تردیدی رویہ پر رکھی گئی ہے یعنی ہم پر لازم ہے کہ پہلے غیراللہ سے تمام تر تعلقات کا انکار کریں، ان کی قوت و اختیار کی نفی کریں اور تب اس مطلق نفی میں ایک استثنا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کے الٰہ ہونے کا اقرار کریں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ الٰہ کے معنی معبود کے ہیں اور عبادت سے مراد چند خاص تعبدی افعال ہیں۔ اسی ابہام نے گنجائش پیدا کی ہے کہ ہم غیراللہ کی ایسی تعظیم بجالاتے ہیں جو عبادت کے دائرے میں آتی ہے۔ لیکن ہم ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اسے تعظیم ثابت کرتے ہیں۔ ہم غیراللہ میں صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات کرتے ہوئے انھیں واضح انداز میں کارساز اور حاجت روا یقین کرتے ہیں لیکن اسے نام دیتے ہیں، قربِ خداوندی کا۔ اسی ابہام کے سبب ہم نے سجدہ کی دو قسمیں قرار دے لی ہیں اور سجدۂ تعظیمی کے پردے میں زندہ اور فوت شدہ بزرگوں کی پرستش کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہم لَا اور اِلَّا اور اِلٰہ کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں۔ اقبال اسی حقیقت کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

این دو حرفِ لَا اِلٰہ گفتار نیست — لَا اِلٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست

نیز یہ کہ:

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم — نگاہ چاہیے اسرارِ لَا اِلٰہ کے لیے

نقطۂ ادوارِ عالم لَا اِلٰہ

لَا و اِلَّا احتسابِ کائنات — لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات

جاوید نامہ میں "لَا اِلٰہ" کے عنوان سے "نژادِ نو" کے نام پیغام دیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

اے پسر ذوقِ نگہ از من بگیر — سوختن در لَا اِلٰہ از من بگیر
لَا اِلٰہ گوئی بگو از روئے جاں — تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
مہر و مہ گردد ز سوزِ لَا اِلٰہ — دیدہ ام این سوز را در کوہ و کاہ
این دو حرف لَا اِلٰہ گفتار نیست — لَا اِلٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست

زیستن با سوزِ او قہاری است لَا اِلٰہ ضرب است و ضرب کاری است

قرآنی مفہوم کے مطابق اگر عقیدۂ توحید کو اپنا لیا جائے تو دُور رس نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ پرانے رشتے منقطع ہو جاتے اور نئے رشتے استوار ہوتے ہیں۔ متعدد مشکلات و مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ بے ادب اور گستاخ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسلاف کی راہ سے برگشتہ ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ غرضکہ عقیدۂ توحید کی راہ میں بے شمار مشکلات ہیں:

چو می گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلاتِ لَا اِلٰہ را

اس شعر میں اقبال نے تبلیغِ توحید اور رسالت و نبوت کی تاریخ کی ایک نہایت عظیم الشان حقیقت کو واضح کیا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی اور جس معاشرہ میں بھی اللہ کے کسی فرستادہ نے، رسول اور نبی نے توحید کی دعوت دی ہے اسے بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تاریخِ رسالت سے کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ دعوتِ توحید کی فطرت ہی کچھ ایسی رہی ہے کہ اس کے ذمہ دار افراد کو کبھی چین نصیب نہیں ہو سکا۔ قرآن کریم نے بعض انبیا علیہم السلام کی دعوتِ توحید کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ اور بعض کا ذکر اجمالی طور پر کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے بھی حقیقت آشکار ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام (۳۹۳۲ تا ۲۸۸۲ ق م) نے جب سرزمینِ دجلہ و فرات کی سمیری آبادی کے سامنے درسِ توحید پیش کیا تو انھوں نے ایک نہ سنی بلکہ دھمکی دی کہ اسے نوح اگر تو اپنی اس تبلیغ سے باز نہ آیا اور اپنے اس نئے مشن کو بند نہ کیا تو تجھے ہم پتھر مار مار ختم کر دیں گے[۵۳]

حضرت ابراہیم علیہ السلام (م ۲۲۰۰ ق م) نے بابل و نینوا کے باشندوں میں جب توحید کی آواز بلند کی تو خود ان کے والد نے شدید مخالفت کی اور کہا کہ اے ابراہیم! کیا تو مجھے میرے سنگوں اور معبودوں سے ہٹانا چاہتا ہے۔ دیکھ! اگر تو اس اقدام سے باز نہ آیا تو اب تجھے سنگسار کر دوں گا[۵۴]

اسی طرح اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کوہِ صفا پر کھڑے

---

[۵۳] القرآن الکریم، الشعرا: ۱۱۶ [۵۴] مریم: ۴۶

ہو کر عرب کے باشندوں کے سامنے توحید کا قرآنی تصور پیش کیا تو وہی لوگ برا کہنے لگے جو آپ کو صادق اور امین کہتے نہ تھکتے تھے۔ طائف میں مشرکوں نے تبلیغِ توحید کی جو سزا پیغمبرِ اسلامؐ کو دی، اس سے ہر مسلمان واقف ہے۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ عقیدۂ توحید کا اظہار ایک زبردست انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرک کا پرچار کرنے والی قوتیں اسے کسی صورت میں گوارا نہیں کر سکتیں۔ راہِ توحید کی یہی وہ مشکلات ہیں جن کے پیشِ نظر اقبال نے کہا ہے:

چو می گویم مسلمانم بلرزم   کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

لیکن ان مشکلات سے یہ مراد نہیں کہ اسلام کا تصوّرِ توحید انسانی سمجھ سے بالاتر چیز ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے اور اسے اپنی زندگی کے ہر شعبہ پر نافذ کرنے کے لیے جن شرائط پر عمل کرنا ضروری ہے، ان پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے   ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے
وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے   طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے
سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے   تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

عقیدۂ توحید پر ایمان لانے اور اس کو ایک سیاسی قوت کے طور پر نافذ کرنے کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے مضبوط اعصاب اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے قرآن پاک کے گہرے وجدانی مطالعہ کی ضرورت ہے اور ایک ایسا جذبہ درکار ہے جو ناقابلِ شکست ہو۔ لیکن ہمارے یہاں ایسے نام نہاد علما و مُلّا بھی قرآن حکیم کی ترجمانی کرنے لگے جن میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ وہ قرآن کے معانی و مطالب کو کماحقہٗ سمجھتے اور مسلم معاشروں میں شرک کی بُرائی کو روک سکتے۔ دینِ اسلام کے زوال کے متعدد اسباب بیان کیے جا چکے ہیں، ان میں اس اہم سبب کو کسی صورت میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کو قصص و حکایات کی کتاب بنا کر عوام میں پیش کیا گیا۔

ہندوستان میں کئی صدیوں تک قرآن کا مقامی زبان میں کوئی ترجمہ نہ کیا گیا تھا۔ یہاں تصوف کے سلسلوں کی ترقی اور نشوونما کے لیے جتنی کوششیں کی گئیں ان

کا عشرِ عشیر بھی مسلمانوں کے ٹھوس اور جامع قرآنی مطالعے کے لیے بروئے کار نہ لائی جا سکیں، اور جب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن کی وسیع اور ٹھوس تفہیم کے لیے فارسی ترجمہ کیا تو ان کے خلاف فتوے جاری کیے گئے۔ تلواریں سونت لی گئیں اور اُن کا جینا دوبھر کر دیا گیا۔ یہ ردِّ عمل ہندوستان کے اسی معاشرے میں سے ظاہر ہوا تھا جو پیری و مُلائی کا نخچیر بن گیا تھا۔ ایسے ہی حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ہے :

دینِ حق از کافری رسوا تر است ... زانکہ مُلّا مومن کافر گر است
شبنمِ ما در نگاہ مایم است ... از نگاہ او یم ما شبنم است
از شکر فیہائے آں قرآں فروش ... دیدہ ام روح الامین را در خروش
زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ ... نزد او اُمّ الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمتِ دین نبیؐ ... آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ... مِلّت از قال و اقولش فرد فرد
مکتبِ مُلّا و اسرارِ کتاب ... کورِ مادر زاد و نُورِ آفتاب

جن ہادیانِ دین و مذہب کا یہ حال ہو اور جو خود شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کے باعث عقیدۂ توحید کی نعمت سے محروم ہو چکے ہوں، ان کی ہدایت اور تعلیم جو نتائج پیدا کر سکتی ہے وہ ظاہر و باہر ہیں۔ اب حالت یہ ہو چکی ہے کہ ہم قرآن کو محض ایک مقدس کتاب سمجھ کر ثواب جمع کرنے کی غرض سے پڑھتے ہیں یا مُردوں کو ثواب پہنچانے کی غرض سے تلاوت کرنا ضروری سمجھتے ہیں یا بیماروں کو شفا دینے اور مرادیں پوری کرنے کے لیے قرآنی آیات کو تعویذوں کی زینت بناتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم عملی طور پر قرآن کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے ہم پہلے دیوبندی یا بریلوی ہیں، اہلِ حدیث یا اہلِ قرآن ہیں، اہلِ تشیع یا اہلِ سنت ہیں اور بعد میں مسلمان! حالانکہ فرقہ بندی روحِ اسلام کے منافی ہے۔ فرقہ بندی کا پیغمبرِ اسلامؐ کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم دوسروں کو رنگ پرستی اور وطن پرستی اور نسل پرستی کا الزام دیتے ہیں لیکن خود ان بُتوں کے سب سے بڑے پجاری ہیں۔ ہم نے امت کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک حصہ محض اُمتیوں پر مشتمل ہے اور دوسرا مذہبی خاندانوں کے افراد پر۔ دوسرے طبقہ

کے لوگوں کو پہلے طبقہ کے افراد پر فضیلت حاصل ہے ۔حالانکہ اس تصور کی حقیقت نہ قرآن میں موجود ہے نہ حدیث میں، اور نہ ہی مجرد عقل اس کی تائید کرسکتی ہے ۔ان حالات کا مداوا کیا ہو۔ اقبال نے بڑے واشگاف انداز میں کہا ہے کہ قوتِ اجتہاد کا احیا ایسے مایوس کن حالات کے مداوا کے لیے ضروری ہے ۔ ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم قرآن کو اپنا پیشوا و امام بنائیں ، اور اس سے براہِ راست تعلق استوار کریں۔ قرآن کی زبان کو سمجھیں اور قرآنی احکامات کی روشنی میں اپنے گردو پیش کا جائزہ لیں۔ کیونکہ قرآن ہمارے لیے کتابِ ہدایت بنا کر نازل کیا گیا ہے نہ کہ کتابِ قرأت :

آں کتابِ زندہ قرآن حکیم ۔۔۔ حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات ۔۔۔ بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
می برد پابند و آزاد آورد ۔۔۔ صید بنداں را بفریاد آورد
نوعِ انساں را پیامِ آخریں ۔۔۔ حاملِ او رحمۃ للعالمیں

قرآن کی تفہیم کے لیے جہاں تفسیری اصول و قواعد کا سمجھنا ضروری ہے وہیں قرآن کی حاکمیت کے اصول پر ایمان لانا اس سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ اگر آپ قرآن کو فیصل نہیں مانتے ، اس کے حکم کے مطابق اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتے تو آپ بے شک رازی اور کشاف سے بھی بڑھ کر تفسیری نکات کو ازبر کرلیں، قرآن کی نگاہ میں آپ کا کوئی مقام نہیں ۔ اگر آپ قرآنی آیات کے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے موضوع ،ضعیف اور غیر مستند حکایات و روایات کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو یقین کیجیے کہ آپ قرآن کی تفہیم میں بالکل اسی طرح ناکام رہیں گے جس طرح ایک عیسائی ، یہودی یا ہندو اپنے تعصّب کے باعث ناکام ہو سکتا ہے ۔ کیوں کہ اقبال کے الفاظ میں

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

اور :

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

عقیدۂ توحید اس تمام قیل و قال سے بلند و بالا تر ہے جو ضعیف الاعتقادی اور اس سے پیدا کی جانے والی نکتہ سنجی کے نتیجہ کے طور پر وجود میں آتی ہے۔ اس کا براہِ راست تعلق قرآن کی تعلیمات سے ہے، اُن سادہ تعلیمات سے جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لیے آسان اور سہل قرار دیا ہے اور جنھیں سمجھنے کے لیے انسان کو گوناگوں صلاحیتوں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ کائنات میں ایسے دلائل رکھ دیے ہیں جن سے ایک غیر جانبدار ذہن اِبا کر ہی نہیں سکتا۔ کائنات کی ہر ایک چیز اپنے خالق کی وحدانیت کی ایک مستقل اور واضح دلیل ہے۔ انسان کی اپنی تخلیق اور اس کی موت پر ہی اگر غور کر لیا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ خالقِ کائنات کے عمل تخلیق و تدبیر میں کوئی شریک نہیں۔ نہ اپنے ذاتی لحاظ سے اور نہ خدا کے عطا کردہ اختیارات کے لحاظ سے۔ پولوس بزرگ کی مرتب کردہ مسیحی تعلیمات میں یہ عقیدہ وضع کیا گیا تھا کہ خدا نے اپنے بیٹے یسوع مسیح کو اپنے اختیارات عطا کر دیے ہیں۔ یہی عقیدہ آج کے عیسائیوں کے ہاں پایا جاتا ہے اور اسی کو مسلمانوں نے مستعار لے کر اپنے عقیدۂ توحید کو مسخ کر دیا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو ان کے عقیدۂ توحید کی انفرادیت کے باعث ہی افضل قرار دیا گیا تھا۔ یہودیوں سے امامتِ اقوام کا منصب اسی لیے چھینا گیا کہ وہ کائناتی ارتقا کی منزلِ مقصود یعنی توحید کی نشر و اشاعت اور ابلاغ عام کے فریضہ کو ادا کرنے سے قاصر ہو گئے تھے۔ امتِ مسلمہ کی تاسیس کا مقصد یہی ہے کہ وہ کائناتی ارتقا کے اس اہم اور ناگزیر تقاضے کو پورا کرے۔ علامہ اقبال کیسے خوب صورت الفاظ میں اس کا اظہار کرتے ہیں:

ملّتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ — سازِ ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما — رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما
اسود از توحید احمر می شود — خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود
ملّت از یک رنگی دلہا ستی — روشن از یک جلوہ این سینا ستی
قوم را اندیشہ ہا باید یکے — در ضمیرش مدعا باید یکے

گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر — نیست ممکن این چنین اندازِ فکر
ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ — از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل

یعنی لَا اِلٰہ ملّتِ اسلامیہ کے جسد کی روح ہے۔ ہمارا وجود اسی کے دم قدم سے قائم ہے۔ ہمارے تمام اسرار و رموز اور افکار و خیالات کا خلاصہ یہی توحید ہے یہی وہ معاشرتی قوت ہے جو اسلامی معاشرے کے کالے اور گورے انسان کو برابری کے مقام پر فائز کرتی ہے:

"اسرار و رموز" کے آخری باب میں سورۂ اخلاص پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں:

اینکہ در صد سینہ پیچد یک نفس — سرّی از اسرارِ توحید است و بس
آنکہ نامِ تو مسلمان کردہ است — از دوئی سوی یکی آوردہ است
خویشتن را ترک و افغان خواندہ ای — وای بر تو آنچہ بودی، ماندہ ای
صد ملل از ملّتی انگیختی — بر حصارِ خویش شبخون ریختی
یک شو و توحید را مشہود کن — غائبش را از عمل موجود کن

یعنی سینکڑوں سینوں میں دلوں کی دھڑکن کا باعث عقیدۂ توحید کا اظہار و اقرار ہی ہے۔ اے مسلمانو! تم نے اپنے اتحاد و اتفاق کو ختم کر کے ایک ملّت میں سے سینکڑوں ملتیں بنا لی ہیں، اور اپنے ہی مضبوط قلعہ کو نقصان پہنچایا ہے، ایک ہو جاؤ اور اپنے اتحاد کا عملی اظہار کرو۔

علامہ اقبال مسلمان کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ تمہارے وجود کا دار و مدار عقیدۂ توحید کی نشر و اشاعت اور اس کے عملی نفاذ پر ہے۔ کائنات میں تمہاری موجودگی کا مقصود یہی ہے اور اگر تم دوسری قوم کی طرح کائناتی ارتقا کے اس تقاضے کو پورا کرنے میں ناکام رہے تو خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لائے گا۔ علامہ اقبال عقیدۂ توحید کے حفظ و نشر کو ملّتِ اسلامیہ کے لیے حیاتیاتی ضرورت قرار دے کر بڑے زوردار انداز میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی ذلّت و رسوائی اور زوال و شکست کا ایک بڑا سبب قرآن کریم سے براہِ راست تعلق کا منقطع ہو جانا اور عقیدۂ توحید کا ترک کر دینا ہے۔ لہٰذا تمہارے لیے ضروری ہے کہ اس کا مداوا کرو اور اپنے وجود کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو قرآن کے اس مطالبہ کو پورا کرو:

نغمہ ہائش خفتہ در سازِ وجود — جویدت اے زخمہ در سازِ وجود

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست | حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست
تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے | گر مسلمانی نیاسائی دمے
آب و تابِ چہرۂ ایام تو | در جہاں شاہد علی الاقوام تو

اس دنیا میں مسلمان قوم ہی شاہد علی الاقوام ہے۔ اس جلیل القدر منصب کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ عقیدۂ توحید کے حفظ و نشر سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں:

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است | در اتی الرحمٰن عبداً مضمر است
تا ز اسرار تو بنماید ترا | امتحانش از عمل باید ترا
دین ازو، حکمت ازو، آئین ازو | زور ازو، قوت ازو، تمکین ازو
عالماں را جلوہ اش حیرت دہد | عاشقاں را بر عمل قدرت دہد
پست اندر سایہ اش گردد بلند | خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
قدرتِ اُو برگزیند بندہ را | نوعِ دیگر آفریند بندہ را
بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات | چشم می بیند ضمیرِ کائنات
چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود | کاسۂ دریوزہ، جامِ جم شود

مسلمان اس وقت نا امیدی و مایوسی کی حالت میں ہیں۔ غالب اقوام کے رعب و دبدبہ کے پیشِ نظر انھیں اپنا وجود معرضِ خطر میں نظر آتا ہے۔ یہ خوف، مایوسی اور ڈر ایسی برائیاں ہیں جو شرک کی کھوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ ان خوفناک معاشرتی برائیوں سے راہِ توحید پر عمل پیرا ہونے سے ہی نجات حاصل کی جا سکتی ہے:

خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، خوفِ جاں | خوفِ آلامِ زمین و آسماں
تا عصائے لا الٰہ داری بدست | ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چوں جاں اندر تنش | خم نہ گردد پیشِ باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست | خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

"پس چہ باید کرد" میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست | بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

با تو می گویم از ایامِ عرب — تا بدانی پختہ و خامِ عرب
ریز ریز از ضربِ او لات و منات — در جہات آزاد از بندِ جہات
عالمی در آتش او مثلِ خس — ایں ہمہ ہنگامہ "لا" بُود و بس

مثنوی مسافر کے درج ذیل اشعار میں یہی حقیقت ایک اور انداز میں بیان کی گئی ہے:

می دہد مارا پیامِ لا تخف — می رساند بر مقامِ لا تخف
قوتِ سلطان و میر از لا الٰہ — ہیبتِ مردِ فقیر از لا الٰہ
تا دو تیغِ لا و الا داشتیم — ما سوا اللہ را نشان نگذاشتیم

علامہ اقبال رح کے کلام کی ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ حالات پر وہ پریشان ضرور ہوتے ہیں لیکن مایوس اور ناامید نہیں ہیں۔ وہ جگہ جگہ مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہیں اور اس پر موثر انداز میں نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کا موضوع یہی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اقبال ملّتِ اسلامیہ کے مستقبل کے بارے میں پُریقین و پُرامید ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کو یقین ہے کہ قرآن کریم میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے اور ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کے موجودہ دور کو نشأۃ ثانیہ قرار دیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان قوم بہرحال عقیدۂ توحید پر عمل پیرا ہو کر اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرے گی۔ کیونکہ:

اُمّتِ مسلم ز آیاتِ خدا است — اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است
از اجل ایں قوم بے پروا ستے — استوار از لنحن نزّلنا ستے

قرآن کریم کی متعدد آیات میں کہا گیا ہے کہ خدا نے اپنے رسول کو توحید کے صحیح اور سچے نظریۂ حیات کے ساتھ بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ تمام باطل نظریات پر غلبہ حاصل کرے۔ یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ خود خدا اس پر گواہی دے رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ قرآنی ارشاد بے حد واضح ہے کہ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ وکفیٰ باللہ شھیدًا۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم خود شناسی سے کام لے کر کائنات کے ارتقا میں اپنا صحیح مقام متعین کریں اور اپنے آپ کو "امت وسط" اور شہادت علی الاقوام کے جلیل القدر مناصب کا اہل ثابت کریں۔